ڈاکٹر مظہر حسین مظہر
ایس ایس ایس اردو، گورنمنٹ ہائر سیکنڈری سکول، جلہ جیم، میلسی

تواریخِ ادبِ اُردو میں "میر شناسی": تحقیقی مطالعہ

Dr. Mazhar Hussain Mazhar
SSS Urdu GHSS, Jallah Jeem, Mailsi

"Mir Shanasi" in Histories of Urdu Literature: A Research Study

ABSTRACT
In this article it has been analyzed that how Urdu historians and researchers explored the poetic horizons of Mir Taqi Mir by studying his life through his books. All the historians gave Proper significance to Mir's autobiography and evaluated his theories and ideas. They basically got information from the early memoir "Zikr e Mir". When we minutely study this historical analysis, we come to know that the influences of Mir cannot be denied on Sauda and his contemporaries. Ghalib and all poets have acknowledged his mastery and perfection. A number of historians also realized the worth of Mir's poetry. They compared Mir's poetic diction with his contemporaries and proved Mir's superiority. Urdu history revealed Mir's criticism trends. Although literature of Urdu history started in 20th century yet a parallel Mir criticism can be seen obviously. History of Urdu literature is considered the primary source of Mir's criticism. In this regard, it has been thoroughly studied historians' remarks on Mir's life and poetry that may be much fruitful to comprehend the real stature of Mir Taqi Mir.

Keywords: *Mir criticism, history of Urdu literature, tradition and trend, History of Urdu Literature, Zikr e Mir, Mir's autobiography.*

اردو ادب میں تاریخ نگاری کا آغاز بیسویں صدی کے اوائل میں ہوا۔ تواریخ اردو میں میر شناسی کے متعدد نقوش موجود ہیں۔ ادبی تاریخ نگاروں نے میر کی حیثیت کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ ان کی شخصیت اور فن سے متعلق بیش بہا معلومات فراہم کیں۔ بیشتر تواریخ میں انہیں شاعری کا میر کہا گیا۔ ان کے یہاں میر و سودا کے موازنے اور مقابلے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ میر شناسی کا یہ گوشہ ان کے فکر و فن کو سمجھنے کے لیے خاصا معاون ہو سکتا ہے اور اسے ہم میر شناسی کا ایک اہم سنگ میل قرار دے سکتے ہیں۔ نمائندہ تواریخ اردو کے غائر مطالعے سے تنقیدِ میر کی رفتار اور معیار سے متعلق اہم نکات منظر عام پر آتے ہیں۔ بیشتر اردو تاریخ نگاروں کی تحقیقات کا مدار "آبِ حیات" رہا۔ جس کی وجہ

Article (2-1-5) Published on 22-05-2024
Tashkeel, Department of Urdu, University of Jhang, E mail: tashkeel@uoj.edu.pk
12KM, Chiniot Road, Jhang, Punjab, Pakistan. 047-7671240

سے تصویرِ میر کے روشن نقوش اجاگر نہ ہوسکے۔البتہ چند ایک مورخین نے وسیع تر تناظر سے ان کے فکری ابعاد دریافت کیے اور شعرِ میر سے نئے رنگ اخذ کیے۔اردو ادب میں تاریخ نگاری کا آغاز بیسویں صدی کے اوائل میں ہوا۔اردو تنقید و تاریخ قدیم تذکروں کی صورت میں موجود تھی۔باقاعدہ تاریخی اور دستاویزی حالت قلم بند کرنے کے سلسلے میں بھی اسلوب تذکرہ ہی برقرار رہا۔تاہم 'گل رعنا' کی اشاعت کے بعد تذکرے نے تاریخ کی سمت جست لگائی ۔"دکن میں اردو" اگرچہ دکنی شعرا کی تاریخ اور تحقیق ہے لیکن اس کتاب کا منظر عام پر آنا دراصل ادبی تاریخ نویسی کا نقطہ آغاز ہے۔ادبی تاریخ نگار کے لیے متعدد خواص کا حامل ہونا ضروری ہے۔ہر ادیب مؤرخ نہیں ہوسکتا اور نہ ہی ہر مؤرخ ادیب ہوتا ہے۔ادبی تاریخ نگار کی یہ بنیادی ذمہ داری ہے کہ وہ گہرا تاریخی شعور رکھنے کے ساتھ تجزیہ اور محاکمہ کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔لسانیات کا ماہر ہو۔حال کا ماضی سے رشتہ جوڑ سکے اور روایت کی تشکیل و تعمیر میں اپنا کردار ادا کرسکے۔اردو تواریخ ادب میں بھی میر تقی میر کا ذکر تواتر کے ساتھ ملتا ہے۔تمام ادبی مؤرخین نے میر کا مقام اور مرتبہ متعین کرنے کی کوشش ہی نہیں کی بلکہ اردو کے دیگر تمام شعرا سے زیادہ اہمیت دی ہے ۔اس مقالے میں میر شناسی کے ضمن میں نمائندہ تواریخ مطالعہ کیا گیا ہے۔

ہسٹری آف اردو لٹریچر رام بابو سکسینہ کی کتاب ہے جس کا اردو ترجمہ مرزا محمد عسکری نے کیا ہے۔یہ کتاب اردو زبان کے آغاز و ارتقا کی مکمل تاریخ ہے۔اس کے چودہ ابواب ہیں۔میر کا ذکر باب ششم میں ہوا ہے۔مصنف نے میر کے ابتدائی کوائف دہلی میں قیام،روانگی لکھنؤ میر صاحب کی عمر،سیادت میں اختلافات،'نکات الشعرا' کا تاریخی تجزیہ، میر کا کریکٹر،نازک مزاجی ، کلام میں مایوسی و درد، تصانیف میر،میر صاحب کی ایجادیں،زبان وشاعری کی خدمات، میر بطور شاعر اور میر و سودا کا مقابلہ کے عنوانات سے میر شناسی کی منزل تک پہنچنے کی عمدہ کوشش کی ہے۔ رام بابو سکسینہ کا قلم نہ صرف اردو ادب کی تدریجی ترقی کا خاکہ پیش کرتا ہے بلکہ ادبا اور ان کی کاوشوں کا تنقیدی جائزہ بھی رقم کرتا ہے۔کتاب ہذا کی تصنیف و تالیف کا مقصد رام بابو سکسینہ کے نزدیک ہندو مسلم اتحاد ہے۔انھوں نے میر کو ریختہ گویانِ ہند کے استاد اعظم اور شاعران اردو کے رہبر مسلم کہا ہے۔ان کے بقول میر ادب و زبان دانی کے ماہر فن،خوش گو،خوش بیان اور شریں سخن ہیں۔حیات میر کے نقوش "ذکر میر" کی روشنی میں اجاگر کیے ہیں۔سکونت دلی اور سفر لکھنؤ کا حال روایتی اسلوب پر گہری تنقید کا غماز ہے۔وہ میر کی سیادت کے قائل ہیں اور کلیات کے بیانات سے شدید اختلاف رکھتے ہیں۔"نکات الشعرا" کے بارے مصنف لکھتے ہیں کہ یہ کتاب نہایت سلیس ہے اور مبالغے اور استعارے سے مبرا ہے۔اس کی تنقید نہایت مختصر مگر منصفانہ ہے۔میر کی نازک مزاجی کو بے دماغی پر محمول کرنا تعجب خیز ہے۔فقر و فاقہ کے عالم میں وضع داری کو نبھانا کس قدر مشکل ہوتا ہے اور کلام میر میں اس کی متعدد مثالیں ان کے حقیقت پسند ہونے کی دلیل ہیں۔رام بابو سکسینہ نے یہاں بھی مولانا آزاد کی آراء کو طشت از بام کیا ہے۔آزاد نے میر کی

فطری کمزوری پر جو گل بوٹے کھلائے ہیں وہ لائق گرفت ہیں۔ آزاد نے بے بنیاد اور غیر قابل اعتماد روایتیں لے کر میر کا مقام و مرتبہ گھٹانے کی کوشش کی ہے۔

میر کی درد مندی ازلی و ابدی ہے۔ یہ درد مندی زمانہ طفولیت میں ہی شان درویشی رکھتی تھی۔ والد، چچا اور صوفیا کے ساتھ میر کی مجلسیں رہیں۔ افسوس کہ یہ مجلسیں جلد برہم ہو گئیں اور میر یگانہ ہو گئے۔ رام بابو سکسینہ نے میر کی ایجادات کا بھی برملا ذکر کیا ہے۔ میر واسوخت، مثلث و مربع جیسی اصناف کے موجد ہیں۔ میر نے فارسی تراکیب کو ریختہ کے اسالیب میں ڈھال کر پیش کیا۔ وہ اردو کے مسلم الثبوت استاد ہیں۔ غزل ان کا خاص میدان ہے۔ ان کا پایہ مثنوی نویسی میں بھی مستند ہے۔ بقول مصنف:

> "مگر حقیقت یہ ہے کہ غزل گوئی میں ان کا جواب نہیں اور اس مملکت میں وہ منفرد اور تنہا حکمران ہیں۔ ان کے اشعار سادہ فصیح اور تیر و نشتر کا کام دینے والے رذات درد واثر سے مملو ہوتے ہیں۔ ان میں دل کشی اور زور کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ اظہار، چستی بندش اور ترنم میں وہ اپنی آپ نظیر ہیں۔"(1)

میر کے بہتر نہیں بلکہ صدہا نشتر ہیں۔ رام بابو سکسینہ انھیں اردو کا سعدی کہتے ہیں۔ میر کی شاعری حقیقت کا آئینہ ہے اور اس کا بھرپور اظہار ان کے معاصرین نے کھل کر کیا ہے۔ آخر میں میر و سودا کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ غزل اور مثنوی میر کے حصے میں اور قصیدہ و ہجو سودا کے حصے میں آئے۔ میر و سودا کے کلام میں فرق دراصل ان کے مزاج اور طبیعت کا اختلاف ہے۔ دونوں اساتذہ واقعہ حال بیان کرنے پر قادر ہیں۔ انھوں نے لفظی مرقعے اس طرح بنائے ہیں کہ یہ زندہ اور چلتے پھرتے محسوس ہوتے ہیں۔ رام بابو سکسینہ میر کو غم پسند اور قوت متخیلہ سے پیدا کیے گئے پریشان خواب شاعر جانتے ہیں جن کا اوڑھنا اور بچھونا صرف اور صرف شاعری ہے۔

تاریخ نظم و نثر اردو کا چھٹا باب اساتذہ دہلی ، طبقہ متوسطین میں میر و سودا کے زمانہ پر مشتمل ہے۔ بیس ابواب پر محیط یہ کتاب اردو کی جامع تاریخ ہے۔ دراصل یہ تاریخ رام بابو سکسینہ کی ہسٹری آف اردو لٹریچر کا خلاصہ ہے۔ آغا صاحب نے اصل ماخذ کے بیانات سامنے رکھتے ہوئے اسے تقریباً چوتھائی حصے میں قلم بند کر دیا ہے۔ میر شناسی کے سلسلے میں اس کا تذکرہ ہسٹری آف اردو لٹریچر کے ضمن میں ہو چکا ہے۔ صفحہ نمبر 47 تا 53 میر تقی میر کی حیات و شاعری کے لیے رکھے گئے ہیں۔

'شعر الہند' حصہ اول چار ابواب پر محیط ہے۔ میر تقی میر کا ذکر پہلے باب میں موجود ہے۔ دیباچہ میں عبدالسلام ندوی نے چراغ شاعری کی تب و تاب کے حوالے سے بتایا ہے کہ شاعری ہر دور میں زندہ رہی ہے۔ ہندوستان میں شاعری نے ہمیشہ انحطاط کے دور میں بھی ارتقائی سفر جاری رکھا۔ اردو میں کوئی ایسی جامع تاریخ

نہیں لکھی گئی جس میں جملہ ادوار کے تغیر و تبدل اور ان کے اثرات کا کلی تجزیہ نہ کیا گیا ہو۔ شعرائے اردو کے تذکرے بھی عہد بہ عہد حالات و واقعات کی تفاصیل فراہم کرنے سے قاصر ہیں۔ میر و مرزا کے اختلافات کب اور کیوں شروع ہوئے؟بقول مصنف میر اور سودا کے کلام میں کلاسیکی شاعری کے تمام محاسن پائے جاتے ہیں۔ دونوں کے ہاں شتر گربہ اور ناہمواریاں بھی ہیں۔ عبد السلام ندوی نے اپنی رائے کی اساس تذکروں پر رکھی ہے۔ میر کے بارے میں بیان کردہ معائب مجتمع کر دیے ہیں۔ انھوں نے میر و سودا کی ہم طرح غزلوں کا موازنہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ میر و سودا مسلم الثبوت استاد الشعرا ہیں۔ معائب کے باوصف میر سودا کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ سودا کی غزلوں میں سوز و گداز کم ہے۔ میر خلوت پسند اور سودا جلوت پسند تھے۔ اس ضمن میں عبد السلام ندوی نے اپنی رائے کی توثیق کے لیے "آب حیات "اور "کاشف الحقائق "سے حوالے بھی پیش کیے ہیں۔ وہ رقم طراز ہیں: "میر کا کلام بھی رطب و یابس کا مجموعہ ہے۔ تاہم ان کی کوئی غزل سوز و گداز سے خالی نہیں ہوتی۔"(2)

انھوں نے میر کی غزل کو سودا پر تفوق دیا ہے لیکن دیگر اصناف میں سودا کا پلڑا میر سے بھاری کر دکھانے کی ٹھان رکھی ہے۔ سودا اور میر کے متعدد اشعار کا موازنہ و مقابلہ علم بیان اور علم بدیع کی روشنی میں کیا ہے۔

نسیم قریشی کی 'اردو ادب کی تاریخ' مختصر نویسی کی حامل ہے۔ انھوں نے میر کے حالات اور شاعری کا مختصر تجزیہ کیا ہے۔ ان کے بقول میر غزل کی وجہ سے بلند ترین مقام پر متمکن ہیں۔ اگرچہ انھوں نے واسوخت ایجاد کی، قصیدہ اور مثنوی بھی کہی لیکن ان کے غم کا سحر غزلوں میں نمایاں ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں:

> "میر کے یہاں اعلیٰ کمالات فن کی بڑی فطری نمود ہے۔ جذبہ کی فطرت اور روح، بحروں، لفظوں اور اسلوب بیان کے انتخاب میں صاف پڑی جھلکتی ہے۔"(3)

ان کی طرز شعر مترنم، میٹھی اور سادہ ہے۔ ان کے مشہور بہتر نشتر ناکامی محبت کا اظہار ہیں۔ نسیم قریشی بھی روایت کے امین نقاد ہیں۔ انھوں نے روایتی انداز سے میر فہمی کی ہے۔

یہ کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔ میر شناسی سے متعلق دوسرے حصے میں روایتی آرا موجود ہیں۔ ڈاکٹر شجاعت سندیلوی نے میر کی سوانح اور شاعری پر مختصر تبصرہ کیا ہے۔ ان کے نزدیک میر کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی سادگی اور شائستگی ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں جملہ خصائص کی بدولت اسے رفعت عطا کی ہے۔ ان کے ہاں مضامین کی جدت، فصاحت و بلاغت، نشتریت و ملاحت، نرمی و شیرینی، غم عشق و غم روزگار اور انفرادیت اور اجتماعیت کے اشتراکات پائے جاتے ہیں۔ میر کا اصل موضوع ان کی غزل ہے۔ یہ غزل تغزل اور خستگی سے مملو ہونے کے ساتھ ساتھ سوز و گداز کی آئینہ دار ہے۔ ان اوصاف کی بنا پر میر ایک بے نظیر غزل نگار شاعر ہیں جن کی غزل نگار خانہ عشق

بن کر رہ گئی ہے۔ حسن کی دیوی ان کی غزل پر فریفتہ ہے لیکن ان کی مثنوی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ مثنویاں ان کے ذاتی اور خارجی احوال کا حسین مرقع ہیں۔

ثنا الحق صدیقی نے ادارہ تحقیق و تصنیف کراچی کے توسط سے اردو شاعری کے عہد زریں "میر و سودا کا دور" شائع کر کے اردو شاعری کی تاریخ کو محفوظ کیا ہے۔ یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ عرض مؤلف اور مقدمہ کے بعد پہلے اور دوسرے باب میں ہندوستان کے آغاز وارتقا کی منازل کا بیان ہے۔ تیسرا باب میر و سودا کے دور کا احاطہ کرتا ہے۔ چوتھے باب میں میر و سودا کے دور کے اہم شعرا کے حالات، زندگی، فکر وفن اور نمونۂ کلام پیش کیا گیا ہے۔ ثنا الحق صدیقی کا نقطہ نظر تاریخی اور دستاویزی اعتبار سے بے حد اہم ہے۔ کتاب کا آخری باب مجموعی جائزہ ہے۔ مصنف نے بیان کیا ہے کہ اردو شاعری کا آغاز امیر خسرو یا سعد اللہ گلشن کے اشعار سے ہوا لیکن اس کا ارتقا میر و سودا کے عہد میں ہوا۔ اس دور میں ایہام گوئی کے خلاف رد عمل شروع ہوا، فارسی اور عربی تراکیب کا رواج عام ہوا، مختلف اصناف سخن متعارف ہوئیں، غزل، مثنوی، قصیدہ اور ہجو نقطہ کمال پر پہنچیں۔ صدیقی صاحب نے تاریخی حقائق کے بیان کے لیے محمد حسین آزاد اور رام بابو سکسینہ کی کتابوں سے حوالے دیے ہیں۔ ان کے مطابق میر و سودا کا دور ہی زریں دور ہے جسے رام بابو سکسینہ نے بھی اسی نام سے یاد کیا ہے۔ میر نے مثنوی میں اپنے دور کا نام خود تجویز کیا تھا جو آج تک مستعمل ہے۔ ثنا الحق صدیقی لکھتے ہیں:

> "میرے نزدیک میر و سودا کا دور نادر شاہ کے حملہ یعنی 1739ء کے بعد شروع ہوا اور میر تقی میر کی وفات 1810ء میں ختم ہو گیا۔"(4)

عہد میر کی شاعری اپنے وقت کی زندگی اور معاشرے کا آئینہ ہے۔ یہ اس دور کی حقیقی تصویر ہے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ شاعری بذات خود بری شے نہیں بلکہ معاشرے کی برائیوں کو اپنے آئینے میں منعکس کر دیتی ہے۔ مجموعی طور پر مصنف نے میر و سودا کے دور کو دیگر تمام ترادوار پر فضیلت اور تفوق دیا ہے۔ انھوں نے اس دور کے نامور شاعر نظیر اکبر آبادی کو شامل نہیں کیا۔ ثناء الحق صدیقی نے اپنی تاریخ نویسی کا مدار سابقہ تاریخی کتب، تذکروں اور شعرا کے کلیات پر رکھا ہے۔ چند ایسی باتوں کی نشان دہی کی ہے جس کا وجود پہلے معدوم تھا۔

توکل حسین قدوائی نے مقدمہ میں ثنا الحق کے تبحر علمی اور حسن ترتیب کی تحسین کی ہے۔ آج کے تجارتی ذہنیت اور مالی منفعت کے دور میں علمی و تحقیقی کاوشوں کا ظہور قابل تعریف ہے۔ ثنا الحق نے میر کے ذکر کے لیے 38 صفحات مختص کیے ہیں۔ ابتدائی بیس صفحات میر کی سوانح اور ان کے عہد کے سیاسی و سماجی حالات کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے میر پر لکھے گئے اردو فارسی تذکروں اور دیگر تنقیدی کتب سے مواد حاصل کیا ہے۔ انقاد میر کے اسلوب میں بھی تذکروں کی جھلک ہے۔ مصنف کے بقول میر کی زبان دانی اور قدرت کلام بے مثل ہے۔ ان

کی شاعرانہ عظمت کا زمانہ معترف ہے۔ انھوں نے میر اور سودا کا موازنہ بھی کیا ہے۔ ثنا الحق نے بھی میر شناسی کے روایتی اسلوب کو برقرار رکھتے ہوئے آزاد کی زبانی میر کا مقام و مرتبہ اور ادبی خدمات کا اعادہ کیا ہے۔ مصنف نے اپنے خیالات کم اور دوسروں کی آرا بکثرت پیش کی ہیں۔ کلام میر کے بلند و پست کے معاملے میں وہ بیان کرتے ہیں:

> "غزل کا میدان جس کے وہ (میر) شہنشاہ کہے جاتے ہیں، نشیب و فراز سے خالی نہیں۔ یہ فقرہ پستش بغایت پست و بلندش بسیار بلند جو اکثر ان کے متعلق دہرایا جاتا ہے۔ کلیتاً غزل پر صادق آتا ہے۔"(5)

سودا اور میر کے موازنے میں عبد السلام ندوی نے غزل اور قصیدہ میں میر کی برتری کو ثابت کیا ہے لیکن ثنا الحق سودا کو قصیدے کا بادشاہ اور میر کو غزل کا شہنشاہ کہتے ہیں۔ مصنف نے 69 کتابیات کی مدد سے اس تاریخی دستاویز کو مرتب کیا ہے۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اردو کے نام ور محقق اور نقاد ہیں۔ ان کی یہ کتاب 'لکھنؤ میں شاعری' متعدد بار ہندوستان اور پاکستان سے شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے۔ باب میں داستان پہلے کے تاریخی پس منظر کی وضاحت ہے، دوسرا باب لکھنؤ کے تمدن کا احوال ہے، تیسرے باب میں لکھنویت کیا ہے؟ پر اصولی بحث کی گئی ہے۔ چوتھے باب میں اردو کے حکم رانوں کی شاعری پر تبصرہ ہے۔ پانچویں باب میں مہاجر شعرائے دہلی کے احوال اور آثار بحوالہ کلام پیش کیے گئے ہیں۔ چھٹا باب ناسخ اور دبستان لکھنؤ کے نمائندہ شعرا کے کلام پر مفصل تبصرہ ہے۔ نویں باب میں اردو مرثیہ کی تاریخ کا بیان ہے۔ آخری باب معاصر لکھنوی شعرا کے کلام اور فکر و فن کا احاطہ کرتا ہے۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری میر کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ کتاب کے دس صفحات میر تقی میر کے نام ہیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے دو سو سالہ لکھنوی شعری روایت کا تجزیہ و محاکمہ کیا ہے۔ وہ مسلسل پچاس سال تک اس میں اضافے اور ترامیم کرتے رہے ہیں۔ لکھنؤ میں مثنوی، مرثیہ، اور نعت پر بھرپور کام ہوا ہے۔ ان سب کا جائزہ لینا بہت ضروری تھا۔ زبان کی خدمات کے سلسلے میں بھی ارباب لکھنؤ کی کاوشیں لائقِ ستائش ہیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے لکھنؤ کی دو سو سالہ شعری روایت کو ماحول اور کلام کے تناظر میں پیش کرنے کی جسارت کی ہے۔ انھوں نے صرف ان شعرا کو شامل کیا ہے جو متقدمین میں بڑا درجہ رکھتے ہوں یا مستقل تصانیف کے تخلیق کار ہوں۔ میر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ 1196ھ میں لکھنؤ وارد ہوئے۔ ان کے بیانات کا ماخوذ بھی "ذکر میر" اور "آب حیات" ہے۔ صدیقی صاحب نے میر کے احوال و واقعات پیش کرنے کے ساتھ میر کی شاعری پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں:

"یہ بات نہایت اہم اور قابل غور ہے کہ میر اور ان کے معاصرین شعرائے دہلی جو اپنا مخصوص انداز لے کر لکھنؤ گئے تھے، لکھنوی شاعری کو بہت کم متاثر کر سکے ناسخ اور آتش کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ میر سے ان کا کوئی رشتہ نہیں۔"(6)

ابو اللیث صدیقی کے مطابق میر کی غزل میں درماندگی ہے جس کا لکھنوی شاعری میں فقدان ہے۔ ناسخ جیسا کامل الفن بھی میر کو ریختہ کا استاد تسلیم کرتا ہے۔ میر حسن کی خوش نصیبی ہے کہ انھیں میر جیسا استاد ملا۔ مصحفی نے بھی رنگ میر کی پیروی کی۔ لکھنوی شاعری پر میر کے اثرات واضح معلوم نہیں ہوتے تاہم اہل لکھنؤ پھر بھی میر کو استاد تسلیم کرتے رہے۔ لیکن لکھنؤی شاعری آخر آخر میر کے رنگ میں ڈھلتی ہوئی نظر آنے لگی۔ لکھنؤ کے آخری دور میں مصحفی کے سلسلہ شاعری کا میلان زیادہ ہوا اور شعرا علی لاعلان میر و غالب کی طرف مائل ہونے لگے۔ میر بذات خود لکھنؤ میں قدردانی کے باوجود Settle نہ ہو سکے۔ وہ دلی کی طرف مراجعت کے آرزومند رہے۔

آباد اجڑا لکھنؤ چغدوں سے اب ہوا
مشکل ہے اس خرابے میں آدم کی بود و باش

آغا افتخار حسین نے قیام یورپ کے دوران میں اہم ادبی و تحقیقی ماخذات پر دسترس حاصل کر کے انھیں مضامین کی شکل میں جمع کیا ہے۔ وہ مغربی علوم کی افادیت کو تسلیم کر کے اسے مشرقی ادبا کے لیے الزم قرار دیتے ہیں۔ ان کے بقول پندرھویں صدی عیسوی سے اہل مشرق کا تمدن روبہ انحطاط ہے۔ اس ضمن میں مشرق اور مغرب کے تمدن کا تقابلی مطالعہ بھی کتاب میں شامل ہے۔ اس کتاب کی ادبی حیثیت تیسرے مضمون بعنوان " تاریخ ادبیات ہندوی و ہندوستانی اور اردو تذکرے " سے معین ہوتی ہے۔ یہ مضمون ادب شناسی کے ساتھ ساتھ میر فہمی کی اچھی کوشش ہے۔ کتاب میں اکیس مضامین شامل ہیں جو آغا صاحب کے ذوق تحقیق کے مظہر ہیں۔

گارساں دتاسی کا تذکرہ " تاریخ ادبیات ہندوی ہندوستانی " اردو زبان کا مقبول تذکرہ ہے۔ آغا صاحب نے اسی تذکرہ سے استفادہ ہی نہیں کیا بلکہ اس کا خلاصہ اردو زبان میں پیش کیا ہے۔ یہ کام اپنی نوعیت کا اہم کام ہے جسے آغا صاحب نے سرانجام دیا۔ اس تذکرے کے دو ایڈیشن پیرس سے جاری ہوئے، پہلا 1839ء- 1847ء دو جلدوں میں اور دوسرا ایڈیشن 1870-71ء میں تین جلدوں میں شائع ہوا۔ گویا یہ تذکرہ میر کی وفات کے تقریباً تیس سال بعد شائع ہوا۔ اس لحاظ سے اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ آغا افتخار حسین نے گارساں دتاسی کا مقدمہ اور تذکرہ تاریخ کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے گارساں دتاسی کی تین جلدیں پڑھنے کے بعد اردو شاعروں کے 59 تذکروں کی مفصل آراء اور معلومات بہم پہنچائے ہیں۔ اردو تاریخ نویسی میں اس کتاب کا حوالہ انتہائی اعتبار کا حامل ہے۔ گارساں دتاسی کو بھی میر شناسی کے ضمن میں رکھا جا سکتا ہے کیوں کہ انھوں نے چند صفحات "نکات الشعرا" کی اہمیت کے لیے

وقف کیے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ اردو کا قدیم ترین تذکرہ ہے جس کی بابت دتاسی نے میر کی سوانح عمری اور کتابیات کے ساتھ نمونہ کلام شعرا بھی دیا ہے۔ دتاسی لکھتے ہیں:

"میر نے ایک سو دو شعرا کے حالات لکھے ہیں جو ریختہ میں شعر کہتے تھے۔ یہ شعرا وہ تھے جو شعر و شاعری کی محفلوں میں شرکت کرتے تھے۔ یہ محفلیں میر درد کے ہاں ہوتیں تھیں۔"(8)

خلاصہ کلام یہ کہ گارساں دتاسی نے "تاریخ ادبیات ہندوی وہندوستانی" فارسی میں مستقل ترجمہ کرکے اردو ادب کے آفاق روشن کیے ہیں۔ انھوں نے اردو ادب خصوصاً (تذکرہ و تاریخ(کا تفصیلی محاکمہ کرکے یورپ میں اردو کے قارئین میں اضافہ کیا ہے۔ یہ کتاب تذکرہ نویسی اور تاریخ ادب اردو پر جامع تبصرہ ہے جسے آغا صاحب نے دوبارہ اردو کے قارئین کے لیے پیش کیا ہے۔ آغا افتخار اور دتاسی اردو زبان و ادب کے مداح ہیں۔ نہ صرف انھوں نے اردو ادب کی خدمت کی ہے بلکہ میر کو خدائے سخن اور اولین تذکرہ نگار قرار دے کر میر شناسی کے حقیقی مقام تک رسائی حاصل کرنے میں شعوری کاوشیں کی ہیں۔ یہ کام تاریخ نگاری کا اہم حوالہ ہے۔

کیپٹن فیاض محمود کی ادارت میں تاریخ نویسی کا یہ سلسلہ پنجاب یونیورسٹی لاہور نے شروع کیا تھا۔ جلد ششم تا دہم اردو ادب کی تاریخ پر مشتمل ہیں۔ میر تقی میر کا حوالہ جلد ہفتم میں موجود ہے۔ جلد ہفتم چودہ ابواب میں تقسیم کی گئی ہے اور پانچواں باب میر تقی میر کے لیے مختص کیا گیا ہے۔ اس باب میں میر پر ڈاکٹر سید عبد اللہ کا مقالہ بھی شامل ہے۔ میر کے حالاتِ زندگی، تصانیف میر اور فکر میر کو تحقیقی انداز میں پیش کرکے میر شناسی کے زریں نکات دریافت کیے گئے ہیں۔ میر کی غزل کا ارتقاع اور قصیدہ و مثنوی کے کمزور پہلوؤں پر بھی بحث کی گئی ہے۔ یہ مقالہ "نقد میر" میں بھی شامل ہے۔

اردو غزل کی تاریخ کے عنوانات میں غزل کا تعارف اور اس کی خصوصیات، اردو کا پہلا غزل گو اور اردو کا پہلا صاحب دیوان غزل گو شاعر کی اصولی بحث کے بعد اردو غزل کو دس ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ میر کا تذکرہ چوتھے دور میں کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی ترتیب وتدوین میں پروفیسر سید احتشام حسین، سید نورالحسن ہاشمی، اور ڈاکٹر ثناالحق صدیقی کی معاونت بھی مصنف کو حاصل رہی ہے جس کا انھوں نے شکریہ ادا کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد اسلام اردو شاعری کی بنیادی روایت سازی کا دور میر و سودا کا دور ہے۔ اس دور کے بانی مرزا مظہر تھے۔ تاہم ایہام کے خلاف مرزا، میر اور سودا نے مزاحمت کی۔ اس عہد کے شعرا نے فارسی شاعری کے اسالیب کو مدنظر رکھا۔ غزل کو صوفیانہ رتبہ حاصل ہوا۔ زبان کی لطافت اور شیرینی کے عناصر سے غزل مقبول عام ہونے لگی۔ میر کی مختصر سوانح کے بعد مصنف ان کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میر غزل کے مسلم الثبوت استاد مانے گئے ہیں۔ ان کے کلام میں سوز و گداز اور درد و الم کی کیفیتیں بہت شدت سے محسوس ہوتی ہیں۔ ان کی زبان سادہ و سلیس، شیریں اور فصیح ہوتی ہے۔ طرز بیان کی دل کشی سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے۔ ان کا اکثر کلام سہل ممتنع کی حدود میں آتا ہے۔"(9)

ڈاکٹر محمد اسلام نے میر شناسی کے روایتی اسلوب کی تقلید کی ہے۔ انھوں نے میر کے غم و الم کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد میر کے چند اشعار بطور نمونہ دیے ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر نفسیاتی دبستان ادب کے نقاد ہیں۔ انھوں نے جہاں اردو ادب کی نمایاں شخصیات کے حالات اور کلام کا تجزیہ و تحسین کیا ہے وہاں میر شناسی کے منصب کو نمایاں سطح پر لایا ہے۔ میر کا تذکرہ اس کتاب کے چوتھے باب میں موجود ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے میر کا نفسیاتی مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے میر کے شخصی اور فنی روپ کے تضادات کو ابھارا ہے۔ میر کے مختصر حالات زندگی کے ساتھ ساتھ ان کے کلام پر بھی بحث کی ہے۔ وہ میر کو بنیادی طور پر غزل گو مانتے ہیں۔ اور ان کی سادگی اور سہل ممتنع کو ضرب المثل قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک میر کی شاعری کی فضا تکیہ کی فضا ہے۔ ان کی طویل بحریں مترنم اور مختصر بحریں صوتی دل کشی کا سامان مہیا کرتی ہیں۔ میر کی زندگی کشمکش اور تضادات کے باعث ناہموار رہی جس کا پرتو ان کے کلام پر نمایاں ہے۔ میر ایک حساس فرد تھے۔

اس کتاب کے آٹھویں باب میں میر فہمی کا حوالہ موجود ہے۔ ڈاکٹر حسن اختر نے میر کی غزلیات میں نغمگیت کی فضا تلاش کی ہے۔ ان کے بقول میر کے ہاں اشعار میں داخلی قافیے کا مسلسل استعمال موسیقیت اور ترنم پیدا کرتا ہے۔ انھیں گلہ ہے کہ ناقدین نے میر کو غم کا شاعر قرار دے کر ان کے نشاطیہ رجحان کی نفی کی ہے حالاں کہ ان کے غم کدے میں نشاط کی بجلیاں بھی چمکتی ہیں۔ ان کی غزل تو الجواب ہے ہی لیکن ان کی مثنویوں کو جائز مقام دینے کی ضرورت ہے۔ مصنف نے میر کی دیگر اصناف کے بارے میں بھی روایتی آراء دی ہیں اور میر کا ان کے ہم عصروں سے ان کا تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔ آخر میں تذکرہ "نکات الشعرا" کا تعارف و تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔

اردو ادب کی یہ تاریخی دستاویز مجلس ترقی ادب کی یادگار ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی نظامت میں مجلس نے اردو ادب کے بیش بہا قیمتی خزانے دریافت کیے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اردو کے مستند نقاد اور مؤرخ ہیں۔ انھوں نے تاریخ ادب اردو کم سے کم لفظوں میں لکھ کر ذمہ داری اور شعور کے ساتھ ادبی تاریخ کو محفوظ کیا ہے۔ جالبی صاحب کا یہ اختصاص ہے کہ وہ تاریخ نگاری کی اساس محض سنی سنائی روایات پر نہیں رکھتے بلکہ تاریخ لکھتے ہوئے وہ ہر شاعر اور ادیب کے ساتھ اپنے شب و روز بسر کرتے ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ تاریخ ادب روح زندگی کا آئینہ ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ادب کو تحقیق، تنقید اور کلچر سے ہم آہنگ کرکے انھوں نے تاریخ نویسی کا نیا اسلوب متعارف کرایا ہے

جہاں شاعرانہ اور داستانوی طرز نگارش کی بجائے تحقیقی اور تخلیقی مزاج پایا جاتا ہے۔ڈاکٹر جالبی کی تاریخ ادب (حصہ دوم) اردو چھ ابواب پر محیط ہے۔میر شناسی ان کا محبوب موضوع ہے۔انھوں نے تفہیم میر کے لیے کتاب میں پانچواں باب مخصوص کیا ہے جس کا نام رد عمل کی تحریک کی توسیع سے موسوم ہے۔اس فصل میں تین ابواب شامل ہیں، پہلے باب میں میر و سودا کے دور کی ادبی اور لسانی خصوصیات گنوائی ہیں۔دوسرا باب محمد تقی میر، حیات، سیرت اور تصانیف کا احاطہ کرتا ہے اور تیسرا باب محمد تقی میر کی شاعری کا مطالعہ ہے۔انتقادمیر کے سلسلے میں جالبی صاحب کی خدمات لائق تحسین ہیں۔تاریخ ادب اردو کے یہی ابواب علاحدہ کتابوں کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔میر کے حالات زندگی اور تاریخی پس منظر کے علاوہ انھوں نے میر کے کلام پر بھی خوب تجزیہ وتبصرہ کیا ہے۔انھوں نے تبصرہ کرتے ہوئے میر پر نہ صرف ناقدانہ نظر ڈالی ہے بلکہ ایک جوہری کی طرح اس میں موجود قدر وقیمت کا تعین بھی کیا ہے۔جالبی صاحب بھی میر کے غم میں بہہ گئے ہیں۔

ہوئی عید سب نے پہنے خوشی و طرب کے جامے
نہ ہوا کہ ہم بدلتے یہ لباس سوگواراں

جالبی صاحب کا نقطہ نظر متعدد تاریخ نگاروں نے اپنایا ہے۔انھوں نے جدید تاریخ نویسی کے اصولوں کو مد نظر رکھا ہے۔میر ایک ایسے شاعر ہیں جو رمز وعلامت سے جذبے کا اظہار کرتے ہیں۔ان کا اصلی میدان غزل ہے۔جالبی صاحب کلام میر کے بلند وپست کے قائل نہیں ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ میر کے کلام کا جو حصہ آج ہمیں پست نظر آتا ہے ہوسکتا ہے کہ اگلی نسل کے لیے معنی و احساس کا عالم دیگر بن جائے۔سچائی کا شعور جس طرح میر کے ہاں پایا جاتا ہے وہ اردو شعرا کو بہت کم نصیب ہوا ہے۔وہ تحریر کرتے ہیں:

> "میر اپنی قوت امتیاز، تنقیدی شعور اور تخلیقی قوت سے اپنی شاعری میں ایک ایسا توازن پیدا کر دیتے ہیں کہ ان کے شعر ہمیں جلاتے نہیں بلکہ پیار کرتے ہیں میر کی شاعری کا یہ توازن یول سس کی کمان کی طرح ہے۔اگر جھک گئی تو پیام فتح اور نہ جھکی تو پیام موت۔"(10)

میر کا تصور عشق انسانی تخیل کا الزمہ ہے اور اس الزمے کے ساتھ حزن وغم کے لے جب شامل ہوتی ہے تو وہ علویت و ارتفاع کا مظہر بن جاتا ہے۔ان کی دل شکستگی تہذیب کی تخریب ہے اور یہ عمل ان کی شاعری کے وسیع دائرے کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ان کا حزن سچا Pathos ہے جس کا اثر تزکیہِ نفس (Catharsis) کا ہے۔یہ وہ مریضانہ قنوطیت نہیں بلکہ یہ قنوطیت علویت سے ہم کنار کر دیتی ہے۔یہ وہی مقام ہے جہاں مغربی رومانوی شاعری کے فلسفہ کی تشکیل ہوتی ہے۔

Beauty is truth and truth is beauty. A thing of beauty is a joy forever.

میر کی انا پرستی اور بے دماغی کے مشہور افسانے بے صداقت ہیں۔ مصنف کے نزدیک میر کی شاعری میں تخلیقی سطح پر بے دماغی اور بد دماغی کا گمان تک نہیں ہوتا۔ ان کی لفظی تصویریں نہایت جان دار ہیں۔ انھوں نے تصویر آفرینی کو امر کرنے کے لیے زندہ محاورات استعمال کیے ہیں۔ میر سادہ ہونے کے ساتھ ساتھ مشکل شاعر بھی ہیں۔ وہ مختصر اور طویل بحروں میں بہت مختلف لگتے ہیں آخر میں سودا و میر کا تقابل کیا گیا ہے۔ اس رجحان کو بعد کے مؤرخین نے بھی اپنایا ہے وہ لکھتے ہیں کہ میر نے اپنی تخلیقی قوتوں سے زندگی کا رس نچوڑ کر اسے اپنی شاعری کے کوزے میں بند کر دیا ہے۔ جب تک زندگی باقی ہے میر کی شاعری بھی باقی رہے گی۔ آخری جملے کو متعدد ناقدین نے دہرایا ہے۔ میر فارسی گوئی کا رجحان طبعی رکھتے ہیں۔ لیکن اردو زبان سے محبت ان کی گھٹی میں ہے۔ وہ فارسی کو اردو پر قربان کر دینے کے لیے تیار ہیں۔

ڈاکٹر محمد صادق نے اردو ادب کی تاریخ کا انگریزی ترجمہ کر کے اردو کے قارئین کا حلقہ وسیع کر دیا ہے۔ انھوں نے انگریزی دان طبقے کو اردو پڑھنے کی بالخصوص جب کہ میر فہمی کی بالعموم کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں میر کی مختصر سوانح کے بعد ان کے فراری ذہن کی تفصیلات بیان کی ہیں اور انھیں بد مزاج کہا ہے۔ معاشرتی بے زاری کے باوجود میر کے غم میں زمانے کی روح موجود ہے۔ ڈاکٹر محمد صادق نے میر کے شہر آشوبوں کا موازنہ سودا کے شہر آشوبوں سے کیا ہے اور نتیجہ نکالا ہے کہ میر کے شہر آشوب سودا سے کسی طرح کم نہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ میر کا انداز بادلوں کی طرح صاف اور اجلا ہے اس میں رنگوں کی قوس قزح جلوہ گر ہے۔ میر نے عوام سے رشتہ جوڑنے کی خاطر سادہ زبان اختیار کی ہے۔ ان کے بہتر نشتر ایک فرضی کہانی ہے۔ میر کا ہر شعر اک نشتر سر تیز ہے۔ ان کے یہاں بلند و پست کا مسئلہ موجود ہے جس کی تفہیم ہونا باقی ہے۔

صغیر احمد جان ادبی تاریخ نویسی میں پر گوئی کا اسلوب رکھتے ہیں۔ انھوں نے تاریخ زبان و ادب اردو کے سترہ ابواب میں اردو کی مکمل تاریخ بیان کی ہے۔ ان کے نزدیک اردو شاعری کا دوسرا دور جسے دورِ زریں بھی کہا جاتا ہے، میر شناسی کے رجحان کا حامل ہے۔ اس کتاب کے چوتھے باب میں میر اور ان کے ہم عصر شعرا کا تقابلی جائزہ لیا گیا ہے۔ میر کی بابت ان کی رائے ہے کہ میر اردو غزل کے بادشاہ ہیں۔ انھوں نے غزل گوئی کو اعلیٰ مقام پر فائز کیا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں:

> "سوز و گداز، شیرینی، مالحت، صداق ت جذبات وغیرہ غزل کی خصوصیات ہیں اور یہ
> خوبیاں کمال میر میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔"(11)

میر کی غزل کمال ہے۔ مصنف نے میر کی غزلیات کے علاوہ ان کی مثنویات اور واسوخت پر بھی تبصرہ کیا ہے لیکن ان کی رائے میں میر کی غزلیات دیگر اصناف سے بھاری ہیں اور انھیں پر میر کی عظمت استوار ہے۔ مثنوی میں میر حسن کا پلڑا میر سے بھاری ہے۔

سید احتشام حسین ترقی پسند نقادہیں۔ انھوں نے ادب کے جملہ موضوعات پر لکھا ہے۔'اردو ادب کی تنقیدی تاریخ' لکھی ہے جو ابواب پر محیط ہے۔اس کتاب میں میر پر مختصر تبصرہ میر شناسی کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ مصنف نے کتاب کے تیسرے باب 'دلی اٹھارویں صدی میں' میر کا تذکرہ ایہام گو شعرا کے ساتھ کیا ہے۔ ان کے خیال میں میر اردو غزل کے آج تک سب سے بڑے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری دل پر تیر کا اثر رکھتی ہے۔ ان کی زبان جتنی شیریں اور میٹھی ہے اس میں اتنی ہی تلخی اور زہرناکی بھی ہے۔ انھوں نے جذبات کی جس قدر نازک مصوری کی ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ ان کا شعر معجزے سے کم نہیں۔ ان کے مرثیے غزلوں سے کم اثر ہیں اور مثنویاں محبت کے احساسات سے لبالب ہیں لیکن غزل کا رنگ یہاں بھی مفقود ہے۔ سید احتشام حسین کی میر شناسی کا تحقیقی جائزہ تنقیدی سرمائے کے تحت ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید نے پانچویں باب میں میر کی شاعری کا رشتہ داخلی و خارجی مرقع قرار دیا ہے۔ ان کے حالات سے جوڑا ہے اور ان کی غزل کو جذبات نگاری کا اعلیٰ بقول میر کی غزل نہ صرف جذبات کی تطہیر کرتی ہے بلکہ جذبات کی تقلیب بھی کرتی ہے۔ یہ غزل تخلیقی کرب کی ایسی زندہ شکل ہے جس میں عجز و انکسار بہ درجہ غایت موجود ہے۔ اس میں ماضی، حال اور مستقبل کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ میر کا تصوف صرف مزاجی ہے یہ حقیقی زندگی کا اوڑھنا بچھونا نہیں ہے۔ ان کی مثنوی غزل کے مقابلے میں کمزور ہے، قصائد میں خامیاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن زبان میر سادہ و پرکار ہے۔ میر کی ہر عہد میں تجدید ہوتی رہے گی۔ اردو شاعری پر میر کے اثرات دوررس اور دیرپا ہیں۔

اردو نظم کے تاریخی پس منظر پر یہ کتاب افادیت رکھتی ہے۔ باب ششم میں اردو نظم کے آغاز وابتدا کی تفاصیل دی ہیں۔ میر شناسی کے لیے اس کتاب کے اٹھارہ صفحات مخصوص ہیں۔ ڈاکٹر ابو سعید نورالدین نے میر کا سوانحی خاکہ میر کی زبانی بیان کیا ہے۔ میر کی شاعری کے خصائص بیان کرتے ہوئے مؤلف لکھتے ہیں کہ اردو غزل میر جیسے شاعر کا انتظار کر رہی تھی۔ میر نے غزل کا معیار قائم کیا۔ انھوں نے مسلسل ریاضت سے اس صنف کو درجہ کمال تک پہنچایا۔ مؤلف نے مولوی عبدالحق کی تحقیقات سے اخذ واستفادہ کیا ہے اور انہی کے حوالہ جات کو پیش کیا ہے۔ میر فہمی کے روایتی انداز کو اپناتے ہوئے انہوں نے کلامِ میر کی خصوصیات کو مجتمع کر دیا ہے۔ یہ تدریسی نقطہ نظر سے اہمیت رکھتا ہے۔ بعد ازاں مصنف نے میر کی دیگر اصناف قصیدہ، مثنوی اور رباعیات پر بھی ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ میر فہمی کے آخری صفحات میں عہد میر پر مختصر تبصرہ ہے۔ ادبیات کی تاریخ میں میر کا دور زریں عہد کہلاتا ہے۔ اس عہد کے تمام

شعرا کا تعلق دہلی سے ہے۔ میر کی لکھنؤ آمد دبستان لکھنؤ کا آغاز ہے۔ ڈاکٹر نورالدین نے مولانا حالی، مولوی عبدالحق اور محمد حسین آزاد کی آراء کی روشنی میں دبستان دہلی اور لکھنؤ کے خواص بھی گنوائے ہیں۔

اردو ادب کی تاریخ' ابتدا سے 1857ء تک ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی یہ کتاب انیس ابواب پر مشتمل ہے۔ انھوں نے زبان کے سفر کے پہلے مرحلے سے لے کر میر انیس کی مرثیہ نگاری کی داستان کو تاریخی تدریج وارتقا کے آئینے میں پیش کیا ہے۔ یہ بیسویں صدی کے تناظر میں وسیع تر علمی معنویت کا مظہر ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے ادبی تاریخ کو سیاسی ور تہذیبی دھاروں کے ساتھ منسلک کر کے ماضی کی بازیافت کی ہے۔ انھوں نے کامیاب ادبی مؤرخ بننے کے لیے ادبی جلوس میں ہم سفر ہونے کی کوشش کی ہے۔ میر شناسی ان کے نزدیک ادبی روایت کا استحکام ہے۔ وہ عہد میر کو عہد ساز شعرا کا دور قرار دیتے ہیں۔ باب دہم میں میر شناسی اور میر فہمی کے ساتھ عہد میر کے خصائص کا بھی تفصیلی تجزیہ کیا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

> "میر کی شعری عظمت کا تصور اس میں ہے کہ اس نے ایک کم مایہ اور سطحی شعری روایت کو فکر وخیال اور اسالیب کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ یہ میر کا کارنامہ خاص ہے کہ اس نے ایک کمزور روایت کو اپنے تخلیقی شعور کی بہ بدولت ایک شعری بصیرت سے مالامال کیا۔"(12)

میر محمد تقی میر کے سوانحی کوائف ڈاکٹر تبسم کاشمیری "ذکر میر" کے حوالے سے درست جانتے ہیں۔ میر کو کم عمری میں کھلونوں کی بجائے ترک تعلق، چل چلاؤ اور عاقبت کے کھلونے تھمائے گئے۔ ایک سال میں تین عزیزاں ذی قدر کا انتقال اندوہ ناک تھا۔ میر ان دردناک مسلسل اموات کو تاعمر نہیں بھولے۔ "ذکر میر" میں Old man Wise کی کہانی ہے جو درویشوں کے احوال پر مبنی ہے جس کے اثرات میر کی زندگی پر انمٹ ثابت ہوئے۔ میر کا خبط نفسیات کی رو سے Sehession Paraeoia کی شکل تھی۔ دلی کی بربادی دراصل میر کی آدرشی مقامات کی بربادی تھی جسے وہ دل پر خوں کی گلابی سے رقم کرتے رہے۔ میر کی عمر ابتدائی اور آخری حصہ سانحہ مرگ کے نظارہ دل دوز میں گزرا۔ تین اموات)بیٹی، بیٹے اور بیوی(نے انھیں مفلوج کر دیا۔ میر کی شاعری کے بارے میں مصنف کا نقطہ نظر دیگر مؤرخین سے مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "میر کا استعاراتی نظام اپنی توانائی اور معنی خیزی کے اعتبار سے توجہ طلب ہے، اس نظام کو دیکھ کر یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ میر جیسا شاعر کس طرح حیات اور کائنات کے ساتھ رابطہ کرتا ہے اور کس طرح سے اس استعارے اور تلازمے اس کی باطنی دنیا کے سرچشموں کا انکشاف کرتے ہیں۔"(13)

میر کے کلام میں چار عناصر کا بیان حقیقت میں چار بنیادی استعارات یعنی آگ پانی ہوا اور مٹی کا بیان ہے۔ میر کا ان عناصر سے گہرا ربط ہے۔ ان کی شاعری میں یہ عناصر ایک جہان معنی رکھتے ہیں۔ میر کے ہاں آگ تجربے کی وسعت کا استعارہ ہے۔ دیگر تمام استعارات حرکت کی طرف مائل ہیں۔ یہ حرکت پذیری انھیں زندگی سے بہت قریب لا کھڑا کرتی ہے۔ اس کے سبب میں ماضی کا اضطراب و کرب کارفرما ہے۔ میر کی شاعری میں انفعالیت مستقل نہیں بلکہ ان کی شاعری کے ہنگاموں نے اس پژمردگی کو دبایا ہے۔ میر کے داخلی اور خارجی تصادم نے ایک شورانگیزی سے حد درجہ استفادہ کیا ہے۔ یہی شعور تخلیقی شخصیت کے وجود کی علامت بن جاتا ہے۔

میر کی شاعری میں علامت کا اک جہان آباد ہے۔ یہ علامتیں زندگی کی ہمہ ہمی اور ہنگاموں کی زینت ہیں۔ میر کا جنون دراصل تہذیب اور ذات کے انفعال کا نتیجہ ہے۔ اور یہ نت نئی تخلیقی قوت کے ساتھ رونما ہو رہا ہے۔ میر کا ختم نہ ہونے والا غم سلیقہ زیست بن گیا ہے۔ وہ بیک وقت ذات اور کائنات کا نوحہ خواں بن کر ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتا ہے۔

'تاریخ ادب اردو' ماضی اور حال کا تازہ ترین حوالہ ہے۔ وہاب اشرفی نے معاصر ادبی رجحانات کو تاریخ میں شامل کر کے اسے نئی جہت دی ہے۔ یہ کتاب طالب علموں اور عام قارئین کے لیے یکساں مفید ہے۔ میر شناسی کے ضمن میں اس کی حیثیت دیگر معروف تواریخ کے مقابلے میں کمزور ہے۔ میر کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ میر کے شاعرانہ مقام پر آج تک کوئی حرف گیری نہیں کر سکا۔ ان کی استادی اور عظمت مسلمہ ہیں لیکن ان کی ذاتی زندگی کے حالات اختلاف کا شکار رہے ہیں۔ انھوں نے متنازعہ فیہ معاملات کو ابھارا ہے اور 'ذکر میر' پر تنقید کی ہے۔ میر شناسی کے بارے میں اشرفی صاحب کا خیال کیا ہے؟ وہ لکھتے ہیں:

> "میر کی شاعری ذہین قارئین کو متاثر کرنے کے باوجود انتشار ذہنی کا شکار بنا سکتی ہے۔ ایک طرف ان کی زندگی ہے تو وہ ماحول، حالات اور زمانہ ہے جن میں وہ گزر رہے تھے یا پھر وہ لوگ ہیں جن سے ان کا انٹریکشن ہوتا رہا تھا یا گاہے گاہے مجادلے کی صورت ابھرتی رہی تھی۔ ایسے بہت سارے دوسرے کیف و کم کو موضوعات کی حیثیت دی جائے تو میر کے بارے میں عجیب و غریب مضامین کا انبار لگ سکتا ہے اور میرا مطالعہ بتاتا ہے کہ ایسا انبار لگا بھی ہے۔"(14)

وہاب اشرفی بھی میر کے غم میں غلطاں دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ وہ مولوی عبدالحق، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر شمس الرحمن فاروقی اور ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی طرح میر کے شعر شورانگیزی کے بھی قائل ہیں۔ انھوں نے ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی رائے 'میر کا ذاتی آشوب، تہذیبی تاریخ کا نوحہ ہے' کی بھرپور تائید کی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں:

"میرا خیال یہ ہے کہ میر کی حسی کیفیت بہت تیز رہی ہے۔یہی سبب ہے کہ ان کے پیکر نہ صرف ان کے اپنے پیکر محسوس ہوتے ہیں بلکہ پڑھنے والے کی بھی حسیات میں داخل ہو کر کچھ عجیب اثر پیدا کرتے ہیں۔اس بات میں ان کا کوئی حریف نہیں۔"(15)

حواشی و حوالہ جات

1۔رام بابو سکسینہ،ہسٹری آف اردو لٹریچر،لاہور:تاج بک ڈپو،1920ء،206۔

2۔عبد السلام ندوی،تاریخ شعر الہند،اعظم گڑھ:مطبع معارف، 1949ء،64۔

3۔ نسیم قریشی،اردو ادب کی تاریخ،لکھنو:ادارہ فروغِ اردو، 1961ء،83۔

4۔ ثنا الحق صدیقی،میر و سودا کا دور،کراچی:ادارہ تحقیق و تصنیف، 1965ء،10۔

5۔ ثنا الحق صدیقی،میر و سودا کا دور،326۔

6۔ابو اللیث صدیقی،لکھنو کا دبستانِ شاعری،کراچی:غضنفر اکیڈمی 1965ء،173۔

7۔افتخار حسین،آغا،یورپ میں تحقیقی مطالعے،لاہور؛مجلس ترقی ادب،1967ء،69۔

8۔افتخار حسین،آغا،یورپ میں تحقیقی مطالعے،70۔

9۔محمد اسلام، اردو غزل کی مختصر تاریخ،کراچی: ؟ 1971ء،81۔

10۔ جمیل جالبی، تاریخ ادبِ اردو،لاہور: مجلس ترقی ادب، 1982ء،576۔

11۔ صغیر احمد جان،تاریخ زبان ادب اردو،کراچی:نفیس اکیڈمی، 1987ء،97۔

12۔ تبسم کاشمیری، اردو ادب کی تاریخ،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز، 2003ء،289۔

13۔ تبسم کاشمیری، اردو ادب کی تاریخ،322۔

14۔وہاب اشرفی،تاریخِ ادبِ اردو،دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،2007ء،226۔

15۔وہاب اشرفی،تاریخِ ادبِ اردو،227۔

References in Roman Script:

1. Ram Babu Saksaina, History of Urdu Literature, Lahore: Taj Book Depot, 1920, P206.
2. Abdul Salam Nadvi, Tarikh Sher-ul Hind, Azam Garh: Matbah-i Muarif, 1949, P64.
3. Naseem Qureshi, Urdu Adab ki Tarikh, Lucknow: Idara Farough-i Urdu, 1961, P83.
4. Sana-ul Haq Siddiqui, Mir-u Sauda ka Daur, Karachi: Idara-i Tahqiq-u Tasnif, 1965, P10.

5. Sana-ul Haq Siddiqui, Mir-u Sauda ka Daur, P326.
6. Abu-ul Lais Siddiqui, Lucnow ka Dabistan-i Shaairi, Karachi: Ghazanfar Academy, 1965, P173.
7. Iftikhar Hussain, Europe mein Tahqiqi Mutalay, Lahore: Majlis-i Taraqi-i Adab, 1967, P69.
8. Iftikhar Hussain, Europe mein Tahqiqi Mutalay, P70.
9. M. Asalim, Urud Ghazal ki Mukhtassar Tarikh, Karachi: ? 1971, P81.
10. Jamil Jalibi, Tarikhi-i Adab-i Urdu, Lahore: Majlis-i Taraqi-i Adab, 1982, P576.
11. Saghir Ahmad Jan, Tarikh-i Zaban-i Adab-I Urdu, Karachi: Nafees Academy, 1987, P97.
12. Tabbasum Kashmiri, Urdu Adab ki Tarikh, Lahore: Sang-I Mil Publications, 2003, P289.
13. Tabbasum Kashmiri, Urdu Adab ki Tarikh, P322.
14. Wahab Ashrafi, Tarikh-i Adab-i Urdu, Delhi: Educational Publishing House, 2007, P226.
15. Wahab Ashrafi, Tarikh-i Adab-i Urdu, P227.